خدا کی مرضی

(تقدیر کا مسئلہ)

پرویز صاحب کی تقریر جس سے انہوں نے

طلوعِ اسلام کنونشن

منعقدہ مارچ ۱۹۶۶ء سے خطاب کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خدا کی مرضی

برکت ابھی چھوٹا سا ہی تھا کہ اس کا باپ مر گیا۔ اس کی ماں بھولی بڑی بے آسرا اور بے سہارا تھی۔ نہ کوئی عزیز نہ رشتہ دار۔ نہ کچھ ہاتھ پلے۔ نہ جائیداد۔ لیکن اس نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ اس نے مسلسل محنت مزدوری کی۔ بچے کی اچھی طرح پرورش کی۔ وہ بڑھا۔ پھولا۔ جوان ہوا۔ کام کاج پر جانے لگا۔ مائی بھولی کے دن پھر گئے۔ اسے سکھ کا سانس آیا۔ وہ بیٹے کو دیکھ کر خوشی سے پھولی نہیں سماتی تھی۔ اب وہ اس کی شادی کی فکر میں تھی کہ ایک رات اچانک برکت کی پسلی میں درد اٹھا۔ رات بمشکل گزاری۔ صبح گاؤں کے سیانے سے دوا لی۔ کچھ فائدہ نہ ہوا۔ وہ بچاری پاگلوں کی طرح ماری ماری پھر رہی تھی۔ اس نے میاں جی سے دم بھی کرایا۔ سائیں جی سے تعویذ بھی لیا۔ درگاہ شریف پر منت بھی مانی۔ لیکن برکت کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔ آخر تین دن کے بعد اس نے تڑپ تڑپ کر جان دیدی۔ مائی بھولی کی دنیا لٹ گئی۔

مائی بھولی وہ تباہ ہو گئی۔ اس کا کوئی نہ رہا۔ خاوند مرا تھا تو اتنی ہمت تھی کہ محنت مزدوری کر کے بچے کو پال لیا۔ اب بڑھاپے میں اس کی ہمت بھی نہ تھی۔ وہ دن رات روتی۔ گاؤں کی عورتیں اسے حوصلہ دلانے کے لئے آتیں اور کہتیں کہ اب صبر کرو۔ صبر کے بغیر چارہ ہی کیا ہے۔ جب اللہ کی مرضی ہی ایسی تھی تو تم کیا کر سکتی تھیں اس مالک کے سامنے کسی کی دم مارنے کی حیا نہیں۔ وہ جو چاہے سو کرے۔ وہ بڑا بے نیاز ہے ـــــ مائی بھولی یہ سن کر خاموش ہو جاتی ـــــ خاموش ہو جانے کے سوا چارہ بھی کیا تھا؟ ـــــ لیکن جب وہ رات کی تنہائیوں میں چپکے چپکے روتی اور سوچتی کہ بالآخر خدا کی مرضی یہی کیوں تھی کہ وہ ایک غریب، بوڑھی عورت کی زندگی کا ایک ہی سہارا چھین کر لے جائے۔ تو یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی۔

عبدالرزاق

عبدالرزاق بڑا محنتی تھا۔ لیکن نہ معلوم کیا بات تھی کہ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالتا اس میں ناکامی ہوتی۔ جو سودا کرتا اس میں خسارہ ہوتا۔ تھوڑی سی پونجی تھی وہ انہی خساروں کی نذر ہوگئی۔ پانچ چھ بچے۔ بیوی۔ بیوہ بہن۔ اتنا بڑا کنبہ۔ آمدنی کی کوئی صورت نہ۔ کال سماں۔ وہ سخت تنگ آگیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، اور وہ کیا کرے۔ وہ جس سے بات کرتا وہ کہتا کہ بھائی میاں! رزق اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ وہ جس کی روزی چاہتا ہے کشادہ کر دیتا ہے۔ جس کی چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ انسان اس میں کچھ نہیں کر سکتا۔ سعدی علیہ الرحمۃ نے کیا خوب فرمایا ہے کہ

بہ ناداں آں چناں روزی رساند
کہ دانا اندراں حیراں بماند

اس لئے انسان کو حیلہ تو ضرور کرنا چاہیئے لیکن یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اسے ملے گا اتنا ہی جتنا خدا چاہے گا۔ یہ پوچھنا انسان کا حق نہیں کہ اسے تنگی کیوں دی جاتی ہے اور دوسروں کو رزق اتنا فراواں کیوں ملتا ہے۔ یہ بات خدا کی مرضی پر موقوف ہے اور خدا سے جھگڑنا یا شکایت کرنا انسان کو کافر بنا دیتا ہے۔ اس لئے مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ راضی برضا رہے۔

محلے کا چودھری

شہامد دس نمبر یہ بدمعاش تھا۔ اول درجہ کا غنڈہ۔ جس سے ہاتھ ملاتا اسے بعد میں دیکھنا پڑتا کہ اس کی پانچوں انگلیاں موجود ہیں۔ ایک آدھ اڈا تو ہیں گی نہ کوئی کام۔ نہ کاج۔ دھوکے فریب پر گزارہ۔ ہر اسال۔ بانکے دھاڑے۔ جنگ کے بعد ملٹری کے ٹرک نیلام ہوئے۔ اس نے جوئے سے کچھ رقم ماری۔ ایک ٹرک خرید لیا۔ اس سے جو کام بڑھنا شروع ہوا تو ایک ٹرک کی جگہ دو۔ دو کی جگہ چار۔ اس کے بعد اس نے دو تین بسیں بنوالیں۔ دھڑا دھڑ آمدنی ہونے لگی۔ گلی میں شاندار مکان بنایا۔ افسروں حاکموں سے رابطہ بڑھا۔ سرکار دربار میں کرسی ملنے لگی۔ اب شہامد محلے کا رئیس تھا۔ اس لئے چودھری الیکشن میں کھڑا ہوا تو کس کی مجال تھی کہ مقابلہ میں سامنے آتا۔ بلا مقابلہ ممبر منتخب ہوگیا۔ اس کا جلوس نکلا تو بڑے بوڑھے سب سر ہلا ہلا کر کہتے تھے کہ ہاں بھائی! عزت اور ذلت سب خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہے شاہنشاہ بنا دے۔ جسے چاہے خاک سیاہ کر دے۔ اس میں انسان کی کاریگری کو کوئی دخل نہیں۔ یہ سب خدا کی شان ہے۔ یہ تمام فیصلے اس کی مرضی کے مطابق ہوتے ہیں۔ کل تک جن کی ڈیوڑھی میں نوبت بجتی تھی وہ آج پیسے پیسے کے محتاج ہو رہے ہیں اور جنہیں کوئی اپنے پاس تک نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ وہ تخت نشین ہوگئے ہیں۔ وہ بڑا بے پرواہ ہے۔

لڑکیوں کی ماں

نور خان کی بیوی کے اوپر تلے چار لڑکیاں پیدا ہوگئیں۔ ہر لڑکی کی آمد پر گھر میں صف ماتم بچھ جاتی۔ چوتھی لڑکی کی پیدائش کے بعد ماں باپ۔ عزیز و اقارب، سب کے اصرار سے نور خان دوسری شادی کرنے کی ٹھان چکا تھا۔ بیوی نے ہزار منتوں سماجتوں سے اسے روکا۔ وہ اس وقت تو رک گیا لیکن بیوی سے صاف صاف کہدیا کہ اگر پھر لڑکی پیدا ہوئی تو وہ ضرور دوسری شادی کرے گا۔ اور بیچاری کی بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ پانچویں بار پھر لڑکی پیدا ہوگئی۔ نور خان کی بیوی کو غش پر غش آتے تھے۔ دل کے دورے پڑتے تھے۔ لیکن اس سے ہر ایک ناراض تھا۔ خاوند اُدھر کا رُخ تک نہیں کرتا تھا۔ وہ تنہا چارپائی پر پڑی روتی رہتی۔ گلی محلے کی عورتیں آتیں اور اسے تسلی دیتیں کہ یہ سب خدا کی مرضی پر منحصر ہے۔ وہ جسے چاہے لڑکے دے۔ جسے چاہے لڑکیاں دے۔ تمہارے رونے دھونے سے کیا حاصل ہے۔ جب خدا کا لکھا ہی ایسا تھا تو اسے کون مٹا سکتا ہے۔ مرضی مولا بر ہمہ اولیٰ۔ صبر شکر کر کے مصیبت برداشت کرو۔ خدا جو کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے۔ وہ مالک ہے۔ جس حال میں چاہے رکھے۔ (حضرت) سلیمانؑ سے جی میں کچھ شکوہ شکایت کیا تھا تو بارہ برس تک بھٹیاری کا بھٹ جھونکنا پڑا تھا۔ اس لئے کوئی ایسی ویسی بات زبان پر نہ لانا۔ وہ بڑا بے پرواہ ہے۔

نادرہ بیچاری

نادرہ کی شادی اس کے خالہ زاد بھائی سے ہوئی تھی۔ یہ لڑکا شروع ہی سے آوارہ تھا۔ عزیز رشتہ داروں نے نادرہ کی ماں سے بہتیرا کہا کہ لڑکا ٹھیک نہیں، لیکن وہ یہی کہتی رہی کہ میں نے پہلے دن سے یہ لڑکی اپنی بہن کو دے رکھی ہے۔ اب میں زبان نہیں بدل سکتی۔ نتیجہ یہ کہ چند ہی دنوں کے بعد، گھر میں لڑائی جھگڑا شروع ہوگیا۔ ساس نے بھی بیٹے کا ساتھ دیا۔ قصہ کوتاہ، نادرہ تپ دق لیکر میکے آ بیٹھی۔ جب اڑوس پڑوس کی عورتیں، نادرہ کی ماں سے افسوس کرتیں تو وہ کہہ دیتی کہ بہن! اس میں کسی انسان کا کوئی بس نہیں ہوتا۔ روحوں کا تو عرش پر ملاپ ہو چکا ہوتا ہے کوئی لاکھ کچھ کرے، رشتہ وہیں ہوتا ہے جہاں کا سنجوگ ہو۔ تقدیر کے آگے کسی کی پیش چل نہیں سکتی۔ ماتھے کا لکھا سامنے آکر رہتا ہے۔ آدمی لاکھ جتن کرے، ہوتا وہی ہے جو خدا کو منظور ہوتا ہے۔ جب اللہ کی مرضی ہی ایسی تھی تو ہم کیا کر سکتے تھے! بڑے بڑوں کی لڑکیاں گھروں میں بیٹھی ہیں۔ ہم کس قطار شمار میں ہیں۔ تقدیر کے سامنے تدبیر کچھ نہیں کر سکتی۔

برادران عزیز! یہ نہ تو کسی برکت اور مائی بھولی کی داستانیں ہیں، نہ عبدالرزاق اور شہامد کے قصے،

روزمرّہ کے واقعات

نہ کسی نورجہان اور اس کی بیوی کی کہانی ہے، نہ نادرہ اور اس کی ماں کا افسانہ- یہ وہ واقعات ہیں جو ہمارے معاشرہ کا جزو ہیں- یہ وہ باتیں ہیں جنہیں ہم ہر روز اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے ہیں جاہلوں ہی میں نہیں، اچھے خاصے لکھے پڑھے لوگوں میں۔ بیوقوفوں میں ہی نہیں، بڑے بڑے سمجھداروں میں- جس جگہ دیکھئے تقدیر کا رونا رویا جاتا ہے- جہاں سنئے انسان قسمت کے ہاتھوں بے بس بتایا جاتا ہے- جس محفل میں بیٹھئے، سرد آہوں کے ساتھ یہ آواز کان میں آتی ہے کہ ــــ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے ــــ جس معاملہ پر گفتگو ہو، ٹیپ کا بند یہی ہوتا ہے کہ

سب کام اپنے کرنے تقدیر کے حوالے
نزدیک عارفوں کے تدبیر ہے تو یہ ہے

"عارفوں" کے نزدیک راضی برضا رہنا، خدا کے مقرب بندوں کی نشانی ہے- وہ حرفِ شکایت زبان پر لانا بارگاہِ صمدیت میں انتہائی گستاخی سمجھتے ہیں- "حرفِ شکایت" تو ایک طرف، ان کی تلقین یہ ہوتی ہے کہ

مرضیِ یار کے خلاف نہ ہو
لوگ میرے لیے دعا نہ کریں

شریعت کا فتویٰ

اربابِ شریعت کی طرف آئیے تو وہ انسان کی ہر بے بسی کی تائید میں قرآن کی کوئی نہ کوئی آیت پڑھ دیں گے۔ مریض کا ذکر ہے تو وعظ کا انداز یہ ہوگا کہ صحت اور بیماری- موت اور زندگی سب خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے ــــ موت کا ایک دن مقرر ہے ــــ اس میں ایک ثانیہ کی بھی کمی بیشی نہیں ہو سکتی- هُوَ يُحْيِي وَ يُمِيتُ وَ هُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۵۷/۲) "وہی مارتا ہے وہی جلاتا ہے- اور وہ ہر شے پر قادر ہے" رزق کے متعلق گفتگو ہوگی تو وہ فرما دیں گے کہ اَوَلَمْ يَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ (۳۹/۵۲)- کیا انہیں معلوم نہیں کہ خدا جس کے لئے چاہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کی روزی چاہے تنگ کر دیتا ہے- عزت اور ذلت کا سوال آئے گا تو یہ آیت فرفر پڑھ دی جائے گی کہ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ (۳/۲۶) "تو جسے چاہے عزت دے- جسے چاہے ذلیل کر دے"- اولاد کا سوال سامنے آئے گا تو کہہ دیا جائے گا کہ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ (۴۲/۴۹) وہ جسے چاہے لڑکیاں دے- اور جسے چاہے لڑکے عطا کر دے- وہ تقدیر کا فلسفہ بیان کرتے کرتے اور آگے بڑھیں گے اور ارشاد فرمائیں گے کہ سن رکھو! يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ (۱۶/۹۳)- وہ جسے چاہے گمراہ کر دے- اور جسے چاہے ہدایت دیدے- وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ (۱۳/۳۳)- جسے وہ گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔

اور جب معاملہ یہاں تک پہنچ جائے تو پھر اگلی بات تو اس کا منطقی نتیجہ ہوتی ہے کہ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲/۲۸۴)۔ وہ جسے چاہے بخشدے۔ جسے چاہے عذاب دے۔ اللہ ہر شے پر قادر ہے — اور پھر اس کی تائید میں اس قسم کی سندیں کہ

اوتھے کیہہ پرواہ ہے راقب اوتھے بے پرواہیاں
پھڑ لئے عملاں والیاں نوں۔ چھڈ دیئے اوگن ہاریاں

بلکہ یہ کہ گنہگار، خدا کو زیادہ پیارے ہوتے ہیں

کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

ہر لگاڑ کے وقت

پھر تماشا یہ ہے کہ "خدا کی مرضی" وہاں آتی ہے جہاں کوئی کام بگڑ جائے۔ مریض کو شفا ہو جائے تو کہا جائے گا کہ فلاں ڈاکٹر کے علاج سے فائدہ ہوا۔ اور اگر وہ مر جائے تو بے ساختہ کہا جائے گا کہ خدا کی مرضی ایسی ہی تھی۔ لڑکا امتحان میں کامیاب ہو جائے تو یہ اس کی اپنی محنت کا نتیجہ ہوتا ہے، اور اگر فیل ہو جائے تو یہ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ لڑکا پیدا ہونے پر گھر والے اکڑ کر چلیں گے اور لڑکی پیدا ہونے پر کہا جائے گا کہ خدا کی مرضی ہی ایسی تھی۔ کاروبار میں ترقی ہو تو انسان کی اپنی ہنرمندی ہے۔ اور اگر وہ ناکام رہ جائے تو یہ خدا کی مرضی تھی۔ غرضیکہ "خدا کی مرضی" شکست اور ناکامی کے وقت سامنے آئے گی۔ حتیٰ کہ اس سلسلہ میں عربی زبان کا ایک فقرہ مقدس سند کے طور پر پیش کر دیا جائے گا۔ (جسے عام طور پر حضرت علیؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے) کہ عَرَفْتُ رَبِّيْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ میں نے اپنے رب کو اپنی اسکیموں کے ناکام رہ جانے سے پہچانا ہے۔

آپ غور کیجئے کہ جس قوم کے اس قسم کے معتقدات اور نظریات ہوں — اور یہ نظریات صدیوں سے متوارث چلے آرہے ہوں، کشمکش حیات میں اس قوم کی شکست خوردگی کی حالت کیا ہوگی، اور زندہ قوموں کی صف میں اس کا مقام کیا؟ ہم اپنے زوال کے اسباب و علل معلوم کرنے کے لئے تحقیقاتی کمیشن بٹھاتے ہیں، لیکن کیا

اسباب زوال

ان معتقدات کی موجودگی میں ہمارے زوال کے اسباب معلوم کرنے کے لئے کسی تحقیق کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ باقی دنیا میں کسی فرد یا قوم کو اپنی اسکیم میں ناکامی ہو جائے وہ کھڑی ہو کر سوچے گی کہ میں نے کہاں غلطی کی جو نتیجہ میرے حسب منشاء نہیں نکلا۔ اس اسکیم کی کامیابی کے وسائل و ذرائع میں کونسی کمی رہ گئی جو میری کوششیں بے نتیجہ رہ گئیں۔ اس مہم کے سر کرنے میں اسباب و علل کی زنجیر کی کونسی کڑی کمزور رہ گئی جو کمند لب بام آکر ٹوٹ گئی۔ وہ قوم کھڑی ہو کر سوچے گی۔ ناکامی کے اسباب

وجوہات کی تحقیق کرے گی۔ اور اس کا سراغ لگانے کے بعد اس کمی کو پورا کر کے، ایک بار پھر کوشش کرے گی۔ اور ایسا کرتی رہے گی تا آنکہ وہ اپنی اسکیم میں کامیاب ہو جائے۔ لیکن جس قوم کا عقیدہ یہ ہو کہ شکست اور ناکامی خدا کی مرضی سے ہوتی ہے۔ اس میں انسان کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ ہر بات، انسان کے دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس کے مقدر میں لکھ دی جاتی ہے۔ اور تقدیر کے لکھے کو مٹانا یا بدل دینا کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہوتا۔ سوچئے کہ مصافِ زندگی میں اس قوم کا کوئی مقام بھی ہو سکتا ہے؟ وہ کشمکش حیات میں کسی خطرہ کا بھی مقابلہ کر سکتی ہے؟ وہ محاسبۂ خویش سے، اپنے نقائص کی درستگی، اور اپنی غلطیوں کی اصلاح سے، ایک قدم بھی آگے بڑھا سکتی ہے؟ نہیں۔ وہ فطرت کے "بقائے اصلح" کے اٹل قانون کے مطابق، دنیا میں زندہ بھی رہ سکتی ہے؟

متضاد ذہنیت

پھر اس میں ایک پہلو اور بھی قابل غور ہے۔ مثلاً جب ایک شخص بیمار ہو جاتا ہے تو ہم اس کے علاج معالجہ کے لئے دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ بہترین ڈاکٹر سے مشورہ کرتے ہیں۔ عمدہ سے عمدہ دوائیاں لاتے ہیں۔ جس علاج سے فائدہ نہیں ہوتا اسے بدل دیتے ہیں۔ ہر قسم کی احتیاط برتتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ مرض اور شفا۔ موت اور زندگی، سب خدا کے اختیار میں ہے۔ اس نے ایک ایک بات کو پہلے سے لکھ دیا ہوا ہے۔ اور اس کے لکھے کو کوئی مٹا نہیں سکتا۔ تقدیر خداوندی کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ پہلے ہی سے مقدر ہے کہ اس شخص کو فلاں وقت پر فلاں بیماری آئے گی۔ اتنے دنوں تک بیماری رہے گی۔ اس کے بعد، یہ اچھا ہو جائے گا۔ یا مر جائے گا۔ اگر یہ سب کچھ پہلے سے مقدر ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، تو پھر اس علاج معالجہ کا کیا فائدہ، اور یہ تگ و دو کس لئے؟ کیا یہ خدا کی تقدیر کے خلاف جنگ نہیں؟ کیا یہ اللہ کی مرضی کا مقابلہ نہیں؟ لیکن جس سے یہ بات کیجئے وہ کہہ دے گا کہ یہ تو حقیقت ہے کہ سب کچھ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے اور اس نے یہ کچھ پہلے سے لکھ دیا ہے لیکن اس کے باوجود، انسان کے لئے تدبیر کرنا بھی فرض ہے! ذرا سوچئے کہ ہم یہ کیا کہتے ہیں؟ کیا ایسا کہنے سے ہم اپنے عقیدہ کا منہ نہیں چڑاتے؟ کیا ہم اپنی تدبیر کی ہنسی نہیں اڑاتے؟ کیا ہم خدا کے اٹل فیصلوں کو بدلنے کی کوشش نہیں کرتے؟ یا کیا ہم دیدہ دانستہ ایک عبث کوشش، اور بے نتیجہ تگ و تاز میں اپنا وقت اور توانائی ضائع نہیں کرتے۔ لیکن ہم وہ بھی مانتے ہیں اور یہ بھی کرتے ہیں۔ خدا کی مرضی پر ایمان رکھنے کے بعد توضیح روش وہی ہے جس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ

مرضیٔ یار کے خلاف نہ ہو لوگ میرے لئے دعا نہ کریں

لیکن مشکل یہ ہے کہ خود یہ کچھ کہنے والا اپنے دکھ کی دوا بھی کرتا ہے اور لوگوں سے اس کے لئے دعا بھی کراتا ہے ــــ آپ کو معلوم ہے کہ اس دو رُخی زندگی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہ جسے نفسیاتی اصطلاح میں تضادِ ذات یا (DUAL PERSONALITY) کہا جاتا ہے اور جس کا فطری نتیجہ انسانی ذات کی تباہی ہوتا ہے۔ اس سے انسان (اور اقوام) کے حوصلے پست، جرأتیں مردہ، عزائم مفلوج، آرزوئیں مصلوب، ولولے پژمردہ اور مقاصد افسردہ ہو جاتے ہیں۔ نہ اُسے کسی بات پر یقینِ محکم ہوتا ہے۔ نہ حصولِ مقصد کے لئے عملِ پیہم۔ ان کی ساری زندگی لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۚ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ (۱۴۳/۴) - کے جہنم میں گذر رہی ہے۔ اور وہ یہ کہہ کر دنیا سے چلے جاتے ہیں کہ

آئندہ و گذشتہ، تمنا و حسرت است
یک "کاشکے" بود کہ بصد جا نوشتہ ایم

یعنی

ہوئی مدت کہ غالب مرگیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا!

سوال یہ ہے کہ کیا قرآن کریم کی یہی تعلیم ہے؟ کیا اس کی ان آیتوں کا، جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے وہی مفہوم ہے جس مفہوم کے لئے انہیں پیش کیا جاتا ہے؟ کیا وہ ہمیں یہی سکھاتا ہے کہ انسان اس دنیا میں ایک مجبورِ محض مشین کی طرح بھیجدیا گیا ہے کہ اس کی ہر حرکت بٹن دبانے والے کی مرضی کے مطابق ہوتی ہے؟ کیا وہ تانگے کا گھوڑا ہے جو اپنی مرضی سے نہ کہیں آسکتا ہے نہ جا سکتا۔ جس راستے پر اس کا مالک چلاتے، اسے چلنا پڑتا ہے؟ کیا وہ ایسا ہی زندانی تقدیر ہے کہ اس کی کوئی تدبیر اسے اس جیل خانے سے نکال نہیں سکتی؟ کیا وہ قسمت کی زنجیروں میں اس طرح جکڑا ہوا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے، کہیں آنا جانا تو ایک طرف، ہل تک بھی نہیں سکتا؟ کیا انسان کی اس دنیا میں یہی پوزیشن ہے؟ آئیے ہم دیکھیں کہ قرآن کریم اس باب میں کیا کہتا ہے - وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

قرآن کی تعلیم

آپ قرآن کریم اٹھائیے۔ اور الحمد سے والناس تک دیکھ جائیے۔ اس کی تعلیم ایک ہی محور کے گرد گردش کرتی دکھائی دے گی۔ وہ محور وہ مرکزی نقطہ ہے قانونِ مکافاتِ عمل۔ یعنی یہ اصولِ اساسی کہ ہر انسان، اپنے کئے کا آپ ذمہ دار ہے اور اسے اپنے ہر عمل کا نتیجہ مل کر رہتا ہے۔ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۵۳/۳۹) انسان کے لئے وہی ہے جس کے لئے

وہ کوشش کرے اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۙ (۵۳/۳۸)۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۖ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ؕ (۱۷/۷)۔ اگر تم اچھے کام کرو گے تو ان کا فائدہ تمہاری اپنی ذات کو ہوگا۔ اگر برے کام کرو گے تو اس کا وبال بھی تمہارے اپنے اوپر پڑے گا۔ قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ عَمِیَ فَعَلَیْهَا ؕ (۶/۱۰۴)۔ تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے واضح حقائق آگئے۔ جو آنکھیں کھول کر انہیں دیکھے گا اس کا فائدہ اسی کو ہوگا۔ جو آنکھیں بند کرلے گا وہ اس روشنی سے محروم رہ جائے گا۔ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ ۝ وَ مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ ۝ (۹۹/۷-۸)۔ جس نے ایک ذرہ برابر بھی اچھا کام کیا ہوگا وہ بھی اس کے سامنے آجائے گا اور جس نے ایک ذرہ برابر برا کام کیا ہوگا وہ اسے بھی دیکھ لے گا۔ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ ۝ فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ ۝ وَ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ ۝ فَاُمُّهٗ هَاوِیَةٌ ۝ (۱۰۱/۶-۹)۔ پھر جس کا اچھے کاموں کا پلڑہ بھاری ہوگا اس کی زندگی بڑی خوشگوار گذرے گی۔ جس کا وہ پلڑا ہلکا ہوگا وہ جہنم میں ہوگا۔ كُلُّ امْرِیٍٔ بِمَا كَسَبَ رَهِیْنٌ ۝ (۵۲/۲۱) ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں رہن رکھا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ وَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ لِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۝ (۴۵/۲۲)۔ خدا نے اس کارگہ کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے تاکہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ مل جائے اور اس پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہ ہو۔ یعنی یہ سلسلۂ کائنات۔ یہ ارض وسما اس لئے رات دن مصروفِ گردش ہے کہ انسان کا کوئی عمل بلا نتیجہ نہ رہنے پائے۔

اختصار کی غرض سے، میں ان چند مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں، ورنہ قرآن کریم سے اس باب میں سینکڑوں آیات پیش کی جاسکتی ہیں۔ ان آیات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ، انسان کو اس کے ہر کام کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے اور اس کا نتیجہ اسے بھگتنا پڑتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ذمہ دار اسے ہی ٹھہرایا جاسکتا ہے جو صاحبِ اختیار و ارادہ ہو۔ جو مجبور ہو، وہ ذمہ دار قرار ہی نہیں پاسکتا۔ جرمِ قتل کا ذمہ دار تلوار کو نہیں ٹھہرایا جاتا جو مقتول کے حلق پر چلی تھی۔ ذمہ دار اس شخص کو ٹھہرایا جاتا ہے جس نے وہ تلوار چلائی تھی۔ اور اسے بھی اسی صورت میں ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے کہ اس نے بقائمی ہوش و حواس قتل کیا ہو۔ پاگل کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو دیگر مخلوق پر جو شرف حاصل ہے وہ اس کے صاحبِ اختیار و ارادہ ہونے کی بنا پر ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ انسان اور دیگر اشیائے کائنات میں، خطِ امتیاز ہی یہ ہے۔ کائنات کی کوئی شے اپنے اختیار و ارادہ سے کچھ

صاحبِ اختیار و ارادہ

نہیں کرتی۔ جو فریضہ جس چیز کے سپرد کیا گیا ہے وہ اسے بلا اختیار و ارادہ مشین کی طرح ادا کئے جا رہی ہے ــــ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ (۱۶/۵۰) انہیں جو حکم دیا جاتا ہے وہ اس کے مطابق کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس، آدم (یعنی انسان) کا تعارف ہی یہ کہہ کر کرایا گیا ہے کہ خدا نے اسے ایک حکم دیا۔ وَ عَصٰى اٰدَمُ رَبَّهٗ (۲۰/۱۲۱)۔ اور اس نے اس حکم کی خلاف ورزی کی۔ آپ دیکھئے! آدم کے تمثیلی قصہ میں، تین کردار ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک ملائکہ ــــ یعنی قوائے فطرت ــــ جن کے متعلق کہا گیا کہ وہ احکام خداوندی کی اطاعت، بلا اختیار و ارادہ کرتے ہیں۔ دوسرے انتہا پر ابلیس، جو اطاعت کرتا ہی نہیں۔ اور ان دونوں کے درمیان آدم، جو معصیت کی قدرت رکھنے کے باوجود، احکام خداوندی کی اطاعت کرتا ہے۔ اور یہی اس کا شرف ہے۔ نیکی اس کی نیکی ہے جو بدی کی قدرت رکھنے کے باوجود نیکی کرے۔ نہ مجبور کی نیکی، نیکی ہے۔ نہ اس کی بدی بدی۔ مجبور کی طرف نیکی اور بدی کو منسوب ہی نہیں کیا جا سکتا۔

آیئے! ہم دیکھیں کہ انسان کے اختیار و ارادہ کی وسعتیں کہاں تک ہیں اور اس کی ذمہ داریوں کی حدود کیا ہیں۔

خدا کی مشیت

خدا نے کائنات کو پیدا کیا تو اس عظیم کارگہ کے حسن و خوبی چلنے کے لئے قوانین مقرر کر دیئے۔ پانی کو اگر اس کی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو نشیب کی طرف بہتا ہے۔ ایک خاص حرارت پر پہنچ کر، بھاپ بن کر اڑنے لگتا ہے دوسری طرف، ایک خاص درجۂ حرارت پر منجمد ہو جاتا ہے۔ آگ حرارت پہنچاتی ہے۔ سنکھیا ہلاک ہے۔ شہد تقویت بخش ہے۔ یہ قوانین خدا نے اپنی منشاء اور مرضی کے مطابق بنائے ہیں۔ اس میں کسی اور کے ارادہ اور منشاء کو کوئی دخل نہیں۔ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ (۱۴/۲۷)۔ "وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (۸۵/۱۶)۔ وہ سب کچھ اپنے ارادے کے مطابق کرتا ہے۔ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ (۲۱/۲۳)۔ کوئی اس سے پوچھ نہیں سکتا کہ اس نے ایسے قوانین کیوں بنائے ہیں۔ اسی لئے ان قوانین کو، قوانین مشیت کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ قوانین جنہیں خدا نے اپنی مرضی سے جس طرح چاہا بنایا ہے۔

ان قوانین کے مطابق اس نے ہر شے میں ایک خاص تاثیر رکھی ہے۔ اسے اس شے کی تقدیر کہتے ہیں۔ قدر کے معنی پیمانے کے ہیں۔ سنکھیا کی تقدیر یہ ہے کہ اس کے پانچ قطرے تقویت بخش ہیں اور پچاس قطرے ہلاکت آفریں۔ آم کی گٹھلی کی تقدیر یہ ہے کہ وہ مناسب نشوونما سے آم کا پیڑ بن جاتی ہے اور اس میں اسی قسم کے آم لگتے ہیں۔ اشیائے کائنات کی یہ تقدیر اٹل ہوتی ہے۔ اسی کو دورِ حاضر کی اصطلاح میں قوانینِ فطرت کہتے ہیں جو غیر متبدل ہیں۔ اسی کو قرآن کریم نے "سنت اللہ" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے ــــ یعنی خدا کی روش جو کبھی

طریقِ کار — اور یہ واضح کر دیا کہ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا (۳۳/۶۲)۔ اس سنت اللہ میں کبھی تبدیلی نہیں آتی۔ خدا کے قوانین غیر متبدل ہیں۔

قرآن کریم کی جن آیات کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ "خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے" ان کا درحقیقت مفہوم یہ

صحیح مفہوم

ہوتا ہے کہ کائنات میں سب کچھ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ اور یہ قوانین اٹل اور غیر متبدل ہیں۔ اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ — اور اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ "خدا ہر شے پر قادر ہے۔" تو اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ خدا نے ہر شے کے لئے پیمانے مقرر کر دیئے ہیں اور جو کچھ ہوتا ہے ان پیمانوں کے مطابق ہوتا ہے۔ مثلاً سورۂ آل عمران میں جنگ میں شکست کے سلسلہ میں کہا کہ) اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؕ جب تمہیں نقصان اٹھانا پڑا — حالانکہ اس سے پہلے تم اس سے دُگنا نقصان دشمن کو پہنچا چکے تھے — تو تمہارے دل میں خیال پیدا ہوا کہ یہ نقصان کس وجہ سے ہوا۔ یہ کہاں سے آگیا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ؕ ان سے کہو کہ یہ خود تمہارے اپنے ہاتھوں کا لایا ہوا ہے۔ کہیں اور سے نہیں آگیا۔ اور اس کے بعد ہے اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (۳/۱۶۴)۔ اب اگر اس ٹکڑے کا وہ مفہوم لیا جائے جو عام طور پر بیان کیا جاتا ہے — یعنی یہ کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے وہ جو جی چاہے کرے۔ تو آیت کے دونوں ٹکڑوں میں نہ صرف یہ کہ کوئی ربط نہیں رہتا بلکہ دونوں ایک دوسرے سے متضاد ہو جاتے ہیں۔ یعنی پہلے کہا کہ یہ مصیبت خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہے۔ کہیں اور سے نہیں آگئی۔ اور اس کے بعد کہا کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ جس طرح جی چاہے کرتا ہے۔ تمہیں یہ پوچھنے کا کیا حق ہے کہ یہ مصیبت کیسے آگئی اور کہاں سے آگئی۔ لہٰذا، اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ کے یہ معنی نہیں ہو سکتے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ خدا نے ہر چیز کے لئے پیمانے اور اندازے (قوانین) مقرر کر رکھے ہیں۔ ہر واقعہ اس کے قوانین کے مطابق سرزد ہوتا ہے۔ تم نے پہلے، ان قوانین کا اتباع کیا تو دشمن کو شکست دی۔ اس دفعہ ان قوانین کی خلاف ورزی کی تو نقصان اٹھایا۔ اس سوال کے دریافت کرنے کی ضرورت کیسے پیش آگئی کہ یہ نقصان کیسے ہوا؟ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ یہ کہاں سے آگیا؟ یہ ہوا خدا کے قانون کے مطابق اور ذمہ دار اس کے تم خود ہو جنہوں نے اس قانون کی خلاف ورزی کی۔ یہ اور کہاں سے آگیا؟

اسی حقیقت کو سورۂ نساء میں ایک اور انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ کہا کہ ان منافقین کی حالت یہ ہے کہ جب انہیں کامیابی ہوتی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ یہ سب خدا کی طرف سے ہے۔ اور جب ناکامی ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ اس کا ذمہ دار رسول ہے۔ یہ اس کی غلط تدبیروں کا نتیجہ ہے۔ اس کے جواب میں کہا کہ ان سے

کہدو کہ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ (۴/۷۸)۔ یاد رکھو! ناکامی اور کامیابی، سب خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ یہ تمام نتائج اس کے قوانین کے مطابق مرتب ہوتے ہیں اس کی تفصیل یہ ہے کہ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰہِ۔ جب تم اس کے قانون کے مطابق چلتے ہو تو کامیابیاں اور خوشگواریاں نصیب ہوتی ہیں وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (۴/۷۹)۔ اور جو مصیبت آتی ہے وہ تمہاری اپنی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ یعنی جب تم خدا کے قانون کے خلاف، اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق کچھ کرتے ہو تو اس کا نتیجہ ناکامی اور مصیبت ہوتا ہے۔

بہرحال، میں کہہ یہ رہا تھا کہ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کے معنی بھی یہی ہیں کہ خدا نے ہر بات کے لئے ایک قانون بنا رکھا ہے اور وہ بات اس قانون کے مطابق واقع ہوتی ہے۔ دھاندلی اور لاقانونیت کا یہاں کوئی کام نہیں۔

قرآن کریم میں بعض آیات اس قسم کی ملتی ہیں کہ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۶/۱۴۹)۔

اگر اللہ چاہتا! اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے ۔۔۔ اگر اللہ چاہتا تو تم سب صحیح راستے پر چلتے"۔ اور اس کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ خدا کا یہ منشاء ہی نہیں کہ تمام لوگ صحیح راستے پر چلیں۔ وہ چاہتا ہی یہ ہے کہ لوگ غلط راستے پر بھی چلیں (اور پھر غلط راستے پر چلنے والوں کو جہنم میں بھیج دیتا ہے! معاذ اللہ)۔ اس قسم کی آیات کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اگر خدا کی مشیت یہ ہوتی کہ تمام انسان، بلا اختیار و ارادہ، دیگر اشیائے کائنات کی طرح، ایک ہی راستے پر چلتے جائیں، تو وہ انسان کو اختیار و ارادہ دیتا ہی نہیں۔ اسے مجبور پیدا کر دیتا۔ لیکن اس کی مشیت کا پروگرام یہ تھا کہ انسان کو اختیار و ارادہ دیا جائے۔ تاکہ یہ اپنی مرضی سے خود صحیح راستے پر چلے۔

اس حقیقت کو سورۂ یونس میں اور واضح الفاظ میں بیان کیا گیا۔ پہلے کہا کہ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا۔ اگر خدا کی مشیت کا پروگرام ایسا ہوتا تو اس کے لئے کیا مشکل تھا کہ وہ انسانوں کو پیدا ہی اس طرح کرتا کہ وہ صحیح راستے پر چلنے کے لئے مجبور ہوتے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے انسان کو اختیار و ارادہ دیا ہے کہ وہ جو راستہ چاہے منتخب کر لے۔ اس کے بعد رسول اللہؐ سے کہا گیا کہ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۱۰/۹۹) تو کیا تو لوگوں کو مجبور کرنا چاہتا ہے کہ وہ بالضرور ایمان لے آئیں! انسان کو زبردستی مومن (یا کافر) بنانا ہماری مشیت کے پروگرام میں نہیں۔

اسی قبیل سے قرآن کریم کی وہ آیات ہیں جن میں "اِنْ شَآءَ اللّٰہ" آتا ہے ۔۔۔ ہمارے ہاں

اِنْ شَآءَ اللّٰہ

"اِنْ شَآءَ اللّٰہ" کا استعمال تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ یعنی جس وعدے کے پورا کرنے کی پہلے ہی سے نیت نہ ہو، اس کے ساتھ "اِنْ شَآءَ اللّٰہ"۔ کہہ کر اپنی منافقت کے لئے خدا کی مشیت کو سپر بنا لیا جاتا ہے۔ آپ اپنے دوست سے کہتے ہیں کہ بھائی! کل چار بجے ٹھیک پہنچ جاؤ گے نا! اور وہ جواب میں کہتا ہے کہ "اِنْ شَآءَ اللّٰہ"۔ تو آپ کہتے ہیں کہ میاں! ٹھیک ٹھیک بات کہو۔ ان شآء اللہ کو چھوڑو۔ اس سے تو تمہاری نیت کا ابھی سے پتہ چل رہا ہے کہ تم آؤ گے نہیں۔ یہ ہے ہمارے ہاں "انشاء اللہ" کا استعمال۔

قرآن کریم میں ان الفاظ کا استعمال دو طرح پر آیا ہے۔ ایک یہ کہ اگر یہ بات خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوئی تو ضرور ہو کر رہے گی۔ مثلاً سورۂ ہود میں ہے کہ جب حضرت نوحؑ سے ان کے مخالفین نے کہا کہ جس تباہی کے متعلق تم ہمیں دھمکیاں دیتے ہو اسے لے کیوں نہیں آتے۔ تو آپ نے جواب میں کہا اِنَّمَا یَاْتِیْکُمْ بِہِ اللّٰہُ اِنْ شَآءَ وَ مَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ ۝ (۱۱/۳۳)۔ اس تباہی کا لانا نہ لانا میرے اختیار کی بات نہیں۔ وہ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق آئے گی۔ جب اسے اُس کے قانون کی رو سے آنا ہوگا تو تم اسے روک نہیں سکو گے۔ وہ ضرور آ کر رہے گی۔

اور دوسرا انداز یہ ہے کہ چونکہ یہ بات خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہے، اس لئے ہو نہیں سکتا کہ یہ واقع ہو کر نہ رہے۔ یہ ضرور واقع ہوگی۔ مثلاً جب حضرت یوسفؑ نے اپنے والدین اور بھائیوں کو کنعان سے اپنے پاس بلا لیا۔ اٰوٰی اِلَیْہِ اَبَوَیْہِ۔ تو اس نے اپنے ماں باپ کو خاص اپنے پاس ٹھہرایا۔ وَ قَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ اٰمِنِیْنَ ۝ (۱۲/۹۹)۔ اور دوسرے اعزہ سے کہا کہ اب تم مصر میں آرام سے رہو گے۔ اس لئے کہ اب تمہارا مصر میں داخلہ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہو رہا ہے۔ اور جب یہ اس کے قانون کے مطابق ہو رہا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تم امن سے رہو گے۔

آپ نے دیکھا کہ وہی "ان شاء اللہ" جو ہمارے ہاں غیر یقینی اور بے اعتمادی کا غماز ہوتا ہے، قرآن کریم کے مفہوم کے مطابق کس قدر حتم و یقین اور مکمل اعتماد کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر اللہ نے چاہا تو ایسا ہوگا۔ اور جب ویسا نہ ہوا تو کہہ دیا کہ کیا کیا جائے۔ خدا نے ایسا چاہا ہی نہیں۔ اس کی ایسی مرضی ہی نہیں تھی۔ اس کی مرضی میں ہوتا تو ایسا ہو کیوں نہ جاتا! اس کے معنی یہ ہیں کہ چونکہ یہ بات خدا کے قانون کے مطابق ہے اس لئے یہ ضرور ہو کر رہے گی۔

⁂

اب انسانی دنیا کی طرف آیئے۔ انسان کی زندگی کے دو حصے ہیں۔ ایک طبیعی زندگی۔ دوسری

انسانی زندگی

اس کی انسانی زندگی۔ اس کی طبیعی زندگی پر انہی قوانین فطرت کا اطلاق ہوتا ہے جو دوسرے حیوانات پر لاگو ہوتے ہیں۔ آگ میں کتا گر جائے یا انسان کا بچہ۔ دونوں جل جاتے ہیں۔ سنکھیا گھوڑا کھائے یا آدمی، دونوں مر جاتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ حیوانات ان چیزوں کو کھا نہیں سکتے جو ان کے لئے مضر ہوتی ہیں — یعنی جنہیں ان پر فطرت نے حرام قرار دیدیا ہے — اور انسان کو اس کا اختیار ہے کہ یہ جی چاہے تو ان سے پرہیز کرے اور جی چاہے تو انہیں کھالے۔ زہر کھانے سے خودکشی کے واقعات، انسان کے اسی اختیار و ارادہ کے مظاہر ہیں۔ حیوانات خودکشی کر ہی نہیں سکتے۔

جس طرح انسان کی طبیعی زندگی کے متعلق قوانین مقرر ہیں، اسی طرح اس کی انسانی زندگی کے لئے بھی قوانین ہیں۔ یہ قوانین اسے وحی کی رو سے ملتے ہیں۔ اسے اس باب میں بھی اختیار حاصل ہے کہ یہ جی چاہے تو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے۔ اور جی چاہے تو ان کے خلاف روش اختیار کرلے۔ یہ اُن کے مطابق چلے گا تو اس کی زندگی خوشگواریوں کی ہوگی۔ ان کی خلاف ورزی کرے گا تو جہنم کی زندگی جیئے گا۔ مثلاً یہ قانون کہ عدل و احسان کا نتیجہ جنت بداماں معاشرہ ہوتا ہے اور ظلم و استبداد کا نتیجہ جہنم کی تباہیاں — خدا کا اٹل قانون ہے۔ اب انسان کی اپنی مرضی ہے کہ وہ اپنا معاشرہ عدل و احسان کی بنیادوں پر متشکل کرکے اپنے لئے جنت پیدا کرلے۔ یا ظلم و استبداد اور سلب و نہب کا نظام وضع کرکے، جہنم کی زندگی بسر کرے۔ انسان کے اس اختیار میں خدا قطعاً دخل نہیں دیتا — اس نے دخل دینا ہوتا تو انسان کو صاحب اختیار پیدا ہی کیوں کرتا؟ وہ انسانوں سے برملا کہتا ہے کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (۴۱/۴۰)۔ تم اپنی دنیا میں جس طرح جی چاہے کرو۔ قانون سازی کی دنیا (عالم امر) میں ہماری مشیت کارفرما تھی۔ ان قوانین کی اطاعت و معصیت کے سلسلہ میں تمہاری مشیت کارفرما ہوگی۔ ہم اس میں دخل نہیں دیں گے۔ بس اتنا سمجھ لو کہ تم جس قسم کی روش اختیار کرو گے، اس کے مطابق نتائج تمہارے سامنے آجائیں گے۔ یہ تو تمہارے اختیار میں ہے کہ تم زندگی کے دوراہے پر دائیں طرف مڑتے ہو یا بائیں طرف۔ لیکن یہ تمہارے اختیار میں نہیں کہ تم مڑو تو دائیں طرف، اور پہنچ جاؤ اس منزل پر جو بائیں طرف کے راستے پر واقع ہے۔

انسانی اختیار

قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۟ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۟ (۱۸/۲۹)

ان سے کہدو کہ حق تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے آگیا۔ اب جس کا جی چاہے اسے اختیار کرلے۔ جس کا جی چاہے اس سے انکار کردے۔

دوسری جگہ ہے اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝ (۷۶/۳)۔ ہم نے اسے

راستہ دکھا دیا ہے اب اس کا جی چاہے تو اسے قبول کر لے۔ جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ سورۂ بلد میں ہے وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝ (۹۰/۱۰)۔ ہم نے انسان کو دونوں راستے دکھا دیئے ہیں۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ (۲/۲۵۶)۔ ہدایت اور گمراہی۔ حق اور باطل۔ غلط اور صحیح۔ نکھر کر اس کے سامنے آ گئے ہیں۔ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۚ (۶/۱۰۴)۔ جو آنکھیں کھول کر چلیگا اس کا فائدہ اسی کو ہوگا۔ جو اندھا بن جائے گا، وہ خود نقصان اٹھائے گا۔

اس باب میں قرآن کریم کا ایک دوسرا انداز بیان بھی ہے۔ مذکورہ بالا آیت میں یوں کہا گیا ہے کہ جو اپنی آنکھیں کھلی رکھے گا، اس کا فائدہ اس کو ہوگا۔ جو بند کر لے گا وہ خود ٹھوکریں کھائے گا۔ لیکن کہیں اس بات کو

مَنْ يَّشَآءُ

اس انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (۲/۱۴۲) اس آیت (اور اس جیسی اور آیات میں) مَنْ يَّشَآءُ کے معنی یہ نہیں کہ خدا جسے چاہتا ہے صراط مستقیم کی طرف ہدایت دے دیتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص صراط مستقیم کی طرف ہدایت لینا چاہتا ہے اسے اس طرف کی ہدایت مل جاتی ہے۔ وَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ (۱۴/۴)۔ اور جو غلط راستے پر چلنا چاہے، خدا کا قانون اسے غلط راستے پر چلاتا رہتا ہے۔ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ (۷/۱۸۶)۔ اور جو اس طرح خود تاریکیوں میں رہے، اسے کون راہ راست پر لا سکتا ہے؟ اس ضمن میں سورۂ نحل کی ایک آیت بڑی واضح ہے۔ آیت ہے۔

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۱۶/۹۳)

اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی جماعت یا فرقہ بنا دیتا۔ لیکن وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھے راستے پر چلاتا ہے۔ اور وہ تم سے پوچھے گا کہ تم نے کس قسم کے کام کیے تھے۔ یعنی پہلے وہ خود ہی انسانوں کی ایک جماعت کو غلط راستے پر ڈال دیتا ہے اور جب وہ اس راستے پر چل کر غلط کام کرتے ہیں، تو اس کے بعد ان سے پوچھتا ہے کہ تم نے ایسے کام کیوں کیے؟ آپ نے غور فرمایا کہ یہ پوزیشن (معاذ اللہ) کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ پہلے خود ہی کسی کو غلط راستے پر ڈال دینا اور اس کے بعد ہنٹر لے کر اس کے پیچھے پڑ جانا کہ تم غلط راستے پر کیوں چلے؟ یہی تھی وہ پوزیشن جسے حافظ نے اپنے شوخ انداز میں ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ

گناہ گرچہ نہ بود از خطائے ما حافظ
تو در طریق ادب کوش و گو خطائے من ست

لیکن قرآن کریم کی آیت کے یہ معنی ہیں ہی نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر اللہ کی مشیت میں ایسا ہوتا کہ تمام لوگ

مجبوراً ایک ہی راستہ پر چلیں تو وہ انہیں پیدا ہی اس طرح کر دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا کہ جس کا جی چاہے غلط راستہ اختیار کر لے اور جس کا جی چاہے صحیح راستہ پر چلے۔ اور یہ اختیار و ارادہ اس لئے دیا گیا کہ اسے اس کے اعمال کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے۔ اور اس سے پوچھا جائے کہ اس نے غلط راستہ کیوں اختیار کیا تھا۔ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص صحیح راستے پر چلنا چاہتا ہے اسے صحیح راستے کی طرف راہ نمائی مل جاتی ہے۔ جو غلط راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے اس کے سامنے غلط راستہ آجاتا ہے۔ یہاں اقدام (INITIATIVE) انسان کے ہاتھ میں ہے۔ جو فیصلہ یہ اپنے لئے کرے، اسی کے مطابق خدا کا قانون اس پر منطبق ہو جاتا ہے۔ یہ آنکھیں بند کر لے۔ اس پر تاریکی چھا جائے گی۔ اگر آنکھیں کھول لے، راستہ روشن ہو جائے گا۔ یہی وہ بنیادی اصول ہے جسے ان چار الفاظ میں سمٹا کر بیان کر دیا ہے کہ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (61:5)۔ جب انہوں نے ٹیڑھی راہیں اختیار کر لیں تو خدا نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔ آپ نے دیکھا کہ خدا کا قانون کس طرح انسان کے فیصلے کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ جیسا کچھ یہ اپنے آپ کو بنا لیتا ہے اسی قسم کا خدا کا قانون اس پر منطبق ہو جاتا ہے۔ جس قسم کا انسان، اسی قسم کی اس کی تقدیر۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

حرفِ بے کیش ہے رمزے مضمر است	تو اگر دیگر شوی، او دیگر است
خاک شو۔ نذرِ ہوا سازد ترا	سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا
شبنمی! افتندگی تقدیر تست	قلزمی! پائندگی تقدیر تست

جو اصول افراد کے لئے ہے وہی اقوام کے لئے۔ اقوام سے متعلق فرمایا کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (13:11)۔ خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اندر تبدیلی نہیں پیدا کرتی۔ جس قسم کی نفسیاتی تبدیلی اس قوم میں ہوگی اسی قسم کی اس کی خارجی حالت ہو جائے گی۔

دل پر مہریں لگنا

افراد کی صورت میں وہ نفسیاتی تبدیلی جس سے انسان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت سلب ہو جاتی ہے، "دل پر مہریں لگنے" کی اصطلاح سے تعبیر کی جاتی ہے۔ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَ عَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (2:7) "اللہ نے ان کے دل پر اور کانوں پر مہر لگا دی۔ اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے"۔ یہاں اس "مہر لگنے" کی نسبت خدا کی طرف کی گئی ہے۔ لیکن دیگر مقامات میں وضاحت سے بتا دیا کہ یہ مہریں لگا کیسے کرتی ہیں۔ سورۂ جاثیہ میں ہے اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہشات ہی کو اپنا معبود بنا لیا۔ جب انسان اس طرح اپنے جذبات

مغلوب ہوجائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ علم و عقل رکھنے کے باوجود، غلط راستے پر چلتا ہے وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ - اسی کا نام دلوں اور کانوں پر مہریں لگ جانا - اور آنکھوں پر پردے پڑ جانا ہے - وَ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (۴۵/۲۳) - دوسری جگہ ہے كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (۸۳/۱۴) - نہیں! بات یوں نہیں جیسے یہ لوگ بزعم خویش سمجھے بیٹھے ہیں - بات یہ ہے کہ خود ان کے اپنے اعمال زنگ بن کر ان کے دلوں پر جم جاتے ہیں - اس کو دل پر مہریں لگنا کہا جاتا ہے -

---

رزق رزق کے معاملہ میں، قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ جو شخص (یا قوم) جس قدر رزق حاصل کرنا چاہے، اسے اسی قدر رزق مل جاتا ہے - جو فطرت کے قوانین کو سامنے رکھ کر ان کے مطابق کوشش اور کام کرے گا، اس کے منفعت بخش نتائج اسے مل جائیں گے - جو محنت نہیں کرے گا - یا محنت غلط طریق پر کرے گا، اس کی روزی تنگ ہو جائے گی - اِنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ (۱۳/۲۶) - جو شخص فراخی سے رزق لینا چاہتا ہے اسے فراخی سے مل جاتا ہے - جو نپی تلی روزی چاہتا ہے اسے نپی تلی ملتی ہے - خدا کا قانون، انسان کی سعی و کاوش کے مطابق نتیجہ پیدا کر دیتا ہے - رزق کی تنگی کے متعلق بتا دیا کہ وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (۲۰/۱۲۴) - جو ہمارے قوانین سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی - اس کے مقابلہ میں کہا کہ وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ - اگر بستیوں والے، قوانین خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتے اور تخریبی امور سے بچے رہتے تو ان پر زمین اور آسمان کی برکات کے دروازے کھل جاتے - وَ لٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (۷/۹۶) - لیکن انہوں نے ان قوانین کی تکذیب کی تو اپنے غلط کاموں کی بدولت پکڑے گئے - یوں قوانین خداوندی کی رو سے رزق کی بسط و کشاد ہوتی ہے - یہ نہیں کہ وہ بغیر کسی قاعدے اور قانون اور سعی و عمل کے، جسے چاہتا ہے چھپر پھاڑ کر بے بہا رزق عطا کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اسے فاقے دیتا ہے - سُبْحٰنَ اللّٰهِ تَعَالٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ - خدا لوگوں کے اس قسم کے خود ساختہ تصورات سے بہت دور ہے -

عزت اور ذلت عزت و ذلت کے سلسلہ میں سورۂ آلِ عمران کی یہ آیت دھڑلے سے پیش کی جاتی ہے - قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ

تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۖ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (۳/۲۶)۔ اور اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ "کہو کہ اے اللہ! تو مالک الملک ہے۔ تو جسے چاہے حکومت اور اقتدار عطا کر دے۔ جس سے چاہے چھین لے۔ جسے چاہے عزت دے جسے چاہے ذلیل کر دے۔ تیرے ہاتھ میں خیر ہے۔ یقیناً اللہ ہر شے پر قادر ہے"

پہلے اقتدار اور حکومت کو لیجئے۔ سورۂ اعراف میں ہے۔ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ (۷/۱۲۸)۔ یقیناً ارض (حکومتِ ارضی) خدا کے تصرف میں ہے۔ اس کے بندوں میں سے جو اسے لینا چاہے، وہ اسے اپنے قانونِ مشیت کے مطابق دیدیتا ہے۔ وہ قانونِ مشیت کیا ہے؟ فرمایا اِنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۔ (۲۱/۱۰۵)۔ وراثت ارض کا اصول یہ ہے کہ یہ انہیں ملتی ہے جن میں اسکی صلاحیت ہوتی ہے۔ قصۂ حضرت طالوت میں اس اصول کو اور واضح کر دیا۔ سوال زیرِ نظر تھا کہ بنی اسرائیل کے لشکر کی کمان کسے دی جائے۔ خدا نے اس کے لئے حضرت طالوت ..... کو منتخب کیا۔ بنی اسرائیل نے اس پر اعتراض کیا اور پوچھا کہ انہیں کس بنا پر منتخب کیا گیا ہے حالانکہ وہ غریب آدمی ہے۔ اس کے پاس فراواں دولت نہیں۔ اس کے جواب میں کہا کہ اس کا معیار دولت نہیں۔ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ تم دیکھتے نہیں ہو کہ اسے کس قدر وسیع علم اور کتنی زیادہ جسمانی قوت حاصل ہے۔ اس بنا پر زمام اختیار اس کے ہاتھ میں دی گئی ہے۔ اور اس کے بعد ہے وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ (۲/۲۴۷)۔ اللہ ان اختیارات کو اپنے قانون مشیت کے مطابق اسے عطا کر دیتا ہے جو انہیں حاصل کرنے کی استعداد اپنے اندر پیدا کرلے۔

جہاں تک عزت و ذلت کا سوال ہے، اس کے متعلق بھی قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ اس کے لئے اصول کیا ہے۔ سورۂ فاطر میں ہے مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا۔ جو عزت حاصل کرنا چاہتا ہے اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ حقیقی عزت صرف خدا کے ہاں سے مل سکتی ہے۔ اس کے لئے اصول یہ ہے کہ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ۚ (۳۵/۱۰)۔ انسان، طیب اور خوشگوار نظریۂ حیات کو اپنے سامنے بطور نصب العین حیات رکھ لے۔ اس قسم کے نظریہ میں از خود بھی اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ بلندیوں کی طرف اٹھتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ جب اعمالِ صالحہ بھی شامل ہو جائیں۔ یعنی ایسے کام جو انسان کی ذات اور حسن کائنات کو سنوارنے والے ہوں — تو اس نظریۂ زندگی کو محیر العقول رفعتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ یوں، اس نظریہ کا حامل انسان، شرف و مجد کی بلندیوں تک پہنچتا چلا جاتا ہے۔ دوسری طرف اس نے بتایا کہ ذلت اور پستی بھی انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہودیوں کے مختلف جرائم گنانے کے بعد

کہا کہ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ ۚ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ان پر ذلت و مسکنت کی مار ماری گئی۔ خدا کا یہ غضب اور تباہی ان پر اس لئے آئی کہ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۟ (۲/۶۱)۔ وہ احکامِ خداوندی سے انکار اور سرکشی برتتے تھے۔ اور ناحق انبیاء کو قتل کر دیتے تھے۔ وہ ہر حکم کی نافرمانی کرتے تھے اور ہر طرح کی حدود فراموش تھے۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم کی رو سے، عزت اور ذلت کے بھی اصول اور ضوابط ہیں۔ یہ نہیں کہ جسے خدا چاہے یونہی بیٹھے بٹھلائے حکومت و ثروت اور عزت و تمکن عطا کر دیتا ہے۔ اور جس سے چاہے، بلا جرم و خطا، ان سرفرازیوں کو چھین لیتا ہے۔ وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ لٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ (۳/۱۱۷)۔ خدا کسی پر ظلم اور زیادتی نہیں کرتا۔ لوگ خود اپنے اوپر زیادتی کرتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ بھگتتے ہیں۔ لہذا، وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ (۳/۲۶) کے معنی یہ ہیں کہ عزت اور ذلت خدا کے مقرر کردہ قوانینِ مشیت کے مطابق ملتی ہے۔

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ خدا نے ہر بات کے لئے قاعدہ اور قانون مقرر کر دیا ہے۔ اور ان قوانین و اصولات میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس نے انسان کو اس بات کا اختیار دیا ہے کہ وہ جی چاہے تو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے اور جی چاہے تو ان کے خلاف روش اختیار کرے۔ وہ جس قسم کی روش اختیار کرے گا اس کے مطابق نتیجہ اس کے سامنے آجائے گا۔ اس باب میں اس پر کسی قسم کا جبر نہیں ہوتا۔ خدا اس کے اختیار و ارادہ کو سلب نہیں کرتا۔ وہ اس کے فیصلوں میں دخل نہیں دیتا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

> جب میرے سامنے عمل کی ایک سے زیادہ راہیں کھلی ہوں، تو اس بات کا فیصلہ مجھے ہی کرنا ہو گا کہ میں ان میں سے کونسی راہ اختیار کروں)۔ خدا کبھی ایسا نہیں کرے گا کہ میری جگہ خود محسوس کرنا یا حکم لگانا شروع کر دے۔ یا میرے لئے راستے کا انتخاب کر دے۔ (خطبات۔ صفحہ ۹۵)

بلکہ غور کیجئے تو خدا کا قانون خود میرے فیصلوں کا اتباع کرے گا۔ مثلاً سورۂ محمدؐ میں ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝ (۴۷/۷)۔ اے جماعتِ مومنین! اگر تم خدا (کے دین کی) مدد کرو گے تو خدا تمہاری مدد کرے گا۔ اور تمہیں استقامت اور ثبات عطا کر دے گا۔

چھپے چھپے چلتا ہے اور اس حتم و یقین کے ساتھ کہ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (۳۰/۴۷) - مومنین کی مدد کرنا ہم پر (خدا پر) فرض ہو جاتا ہے۔ وہ ضرور ایسا کرتا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ خدا کی طرف سے عطا کردہ انسان کی آزادیوں کی کیا شان ہے؟

دنیا میں حیوانات کے سامنے ایک ہی راستہ ہوتا ہے اس لئے ان کی صورت میں انتخاب (CHOICE) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بکری کے سامنے گھاس اور گوشت دونوں رکھے ہوں - وہ گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گی۔ گھاس کھانے لگ جائے گی۔ اس لئے کہ اسے اس کا اختیار ہی نہیں دیا گیا کہ وہ ان دونوں میں سے جسے چاہے اپنے لئے منتخب کر لے۔ اس کے برعکس، انسان کے سامنے بیک وقت مختلف ممکنات (POSSIBILITIES) ہوتی ہیں۔ اور یہ اس کے اختیار میں ہوتا ہے کہ ان میں سے جو راستہ چاہے منتخب کر لے۔ جس قسم کا راستہ یہ اختیار کرے گا اسی قسم کا نتیجہ اس کے سامنے آجائے گا۔ یہ اس کی تقدیر ہو گی۔ یعنی انسان کو اس کا تو اختیار ہے کہ وہ مختلف راستوں میں سے جو راستہ چاہے اپنے لئے منتخب کر لے لیکن اسے اس کا اختیار نہیں کہ وہ جو راستہ اس طرح منتخب کرے، اس کا نتیجہ اپنی مرضی کے مطابق بدل لے۔ یہ نتیجہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق مرتب ہو گا۔ یہاں انسان مجبور ہو گا۔

اس سے واضح ہے کہ انسان اپنے عمل میں صاحبِ اختیار ہے لیکن اس کا نتیجہ بدلنے کا اسے کوئی اختیار نہیں۔ یہ ہے جبر و قدر کا صحیح مفہوم۔

جو لوگ، انسان کو مجبورِ محض ٹھہراتے ہیں، ان کی طرف سے قرآن کریم کی دو ایک اور آیات بھی پیش کی جاتی ہیں جن کا صحیح مفہوم سامنے لانا بھی ضروری ہے۔ سورۂ دہر میں ہے اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝ یہ قرآن تو ایک فراموش کردہ حقیقت کی یاد دہانی کراتا ہے۔ اس کے بعد جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف راہ اختیار کر لے۔ لیکن اس کے بعد ہے **مَا تَشَآءُوْنَ** وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (۷۶/۳۰ — ۲۹) - (اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے) لیکن لوگ کچھ چاہ ہی نہیں سکتے۔ بجز اس کے جو خدا چاہے۔ اسی طرح سورۂ تکویر میں ہے اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۙ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ۔ قرآن تمام اقوامِ عالم کے لئے یاد دہانی ہے۔ تم میں سے جو بھی سیدھے راستے پر چلنا چاہے (وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے) اور اس کے بعد ہے۔ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۸۱/۲۹ — ۲۷) - (اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے) تم کچھ چاہ ہی نہیں سکتے بجز اس کے جو اللہ چاہے۔

آپ ان آیات اور ان کے ان تراجم پر غور فرمائیے - یعنی پہلے کہا گیا ہے کہ تم میں سے جس کا جی چاہے سیدھا راستہ اختیار کرے - اور اس کے بعد ہے کہ تم اپنی مرضی سے کچھ چاہ ہی نہیں سکتے - تم تو مجبور ہو - تم وہی چاہ سکتے ہو جو خدا چاہے - یعنی تمہارا عمل ہی نہیں، بلکہ تمہارا ارادہ اور فیصلہ بھی خدا کے فیصلے کے تابع ہے - تم اس کے خلاف کچھ فیصلہ ہی نہیں کر سکتے - یعنی انسان سے کہا جا رہا ہے کہ تم اپنے فیصلے میں آزاد ہو - جو جی میں آئے اپنے لئے فیصلہ کر لو - اس پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں - بس اتنی سی پابندی ہے کہ تم خدا کے فیصلے کے خلاف کوئی فیصلہ کر ہی نہیں سکتے - تمہیں اس کی استطاعت ہی نہیں کہ آزادانہ کوئی فیصلہ کر سکو - تمہارا ارادہ، خواہش - فیصلہ - انتخاب، وہی ہوگا جو خدا چاہے گا - تم اسے لاکھ اپنا فیصلہ کہو - وہ تمہارا فیصلہ ہو نہیں سکتا -

آپ سوچئے کہ کیا خدا ایسی بات کہہ سکتا ہے کہ تم جس طرح کا جی چاہے فیصلہ کر لو - اس کا تمہارا اختیار ہے - اور اس کے بعد کہے کہ تم اپنے اختیار اور مرضی کے مطابق کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے - فیصلہ ہماری مرضی کے مطابق ہوگا - ایسا کہنا می ترسد خدا لے را - یہ خدا کے شایانِ شان نہیں - ان آیات کے معنی یہ ہیں کہ ویسے تو تمہیں اختیار ہے کہ اپنے لئے جس قسم کا فیصلہ جی چاہے کرو - لیکن تمہیں چاہئے کہ تم وہی فیصلہ کرو جو خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہو - مثلاً یہ تمہارے اختیار میں ہے کہ تم سچ بولو یا جھوٹ - لیکن تمہارا عمل خدا کے قانون کے مطابق اسی صورت میں ہوگا کہ تم سچ بولو - جھوٹ نہ بولو - اس لئے تمہیں چاہئے کہ تم سچ بولنے ہی کا فیصلہ کرو - تمہارا یہ فیصلہ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوگا - اس لئے اس کا نتیجہ نہایت خوشگوار مرتب ہوگا - ہم نے تمہیں صحیح بات بتا دی ہے - آیندہ تمہارا اختیار ہے - اسے مان لوگے تو تمہیں خوشگواریاں نصیب ہوں گی - نہ مانو گے، تو نقصان اٹھاؤ گے -

---

یہ ہے برادرانِ عزیز! قرآن کریم کی رو سے، خدا کی مرضی اور انسانی اختیار و ارادہ کی پوزیشن - جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، ہم ہر بات میں یہ کہہ دیتے ہیں کہ خدا کو منظور ہی ایسا تھا - اس کی مرضی یہی تھی - انسان اس باب میں کیا کر سکتا ہے - آپ یہ معلوم کر کے یقیناً متعجب ہوں گے کہ قرآن کریم نے اسے راہ گم کردہ انسانوں کا عقیدہ اور دورِ جہالت پر مبنی نظریہ قرار دیا ہے - ذرا غور سے سنئے کہ وہ اس باب میں کیا کہتا ہے - سورۂ انعام میں ہے سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِن شَيْءٍ

تقدیر کا عقیدہ

یہ مشرکین کہتے ہیں کہ اگر اللہ کو منظور نہ ہوتا تو نہ ہم شرک کرتے نہ ہمارے آباؤ اجداد شرک کرتے - نہ ہی ہم یونہی کسی شے کو حرام قرار دیتے - (لیکن کیا کیا جائے - خدا کو منظور ہی ایسا تھا) - قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ

كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ (یہ انہی پر موقوف نہیں) ان سے پہلے لوگوں نے بھی اسی طرح حقیقت کو جھٹلایا تھا اور اپنے اعمال کو خدا کے سر تھوپنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ انہیں اپنے اعمال کے نتائج کا مزہ چکھنا پڑا۔ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ ان سے پوچھو کہ کیا تمہارے پاس ایسا کہنے کی کوئی سند اور دلیل ہے۔ اگر ہے تو اسے پیش کرو۔ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۝ (۶/۱۴۸)۔ (نیز ۴۳/۲۰) سند اور دلیل ان کے پاس کچھ نہیں یہ محض اپنے قیاسات کے پیچھے چلتے اور اٹکلیں دوڑاتے رہتے ہیں وَ قَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝ (۴۳/۲۰)۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر خدا کو منظور ہوتا تو ہم معبودانِ باطل کی پرستش کبھی نہ کرتے۔ انہیں حقیقت کا علم نہیں۔ یہ محض اٹکلے دوڑاتے ہیں۔ سورۂ یٰسین میں ہے وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ۖ (۳۶/۴۷)۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم (محتاجوں کی پرورش کے لئے) اس رزق کو کھلا رکھو جو خدا نے تمہیں دیا ہے، تو کافر مومنوں سے کہتے ہیں، کہ کیا ہم ان لوگوں کے کھانے پینے کا انتظام کریں، جنہیں اگر خدا چاہتا تو خود کھانے کو دے دیتا۔ (ان کے بھوکے رہنے سے تو صاف ظاہر ہے کہ خدا کی مرضی یہی ہے کہ یہ اسی حالت میں رہیں۔ ان کی حالت سنوارنے کے لئے کچھ کرنا خدا کی مرضی کے خلاف چلنا ہے۔ ہم ایسا کس طرح کر سکتے ہیں؟ کہا کہ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۳۶/۴۷)۔ ان سے کہو کہ تم لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ ایسا سمجھنا اور کہنا، کہ خدا کی مرضی ہی ایسی تھی۔ اگر وہ چاہتا تو کبھی ایسا نہ ہوتا۔ قرآن کی رو سے کس قسم کا نظریہ اور کن لوگوں کا عقیدہ بتایا گیا ہے؟ یہ اس لئے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ سب کچھ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ انسان مجبورِ محض ہے۔ وہ اپنی ذمہ داریوں سے راہ فرار اختیار کرتا ہے۔ وہ اپنی ذات سے انکار کرتا ہے۔ کہ انسانی ذات کا تو مطلب ہی اس کا صاحب اختیار و ارادہ ہونا، اور اپنے ہر فیصلہ اور عمل کا ذمہ دار بننا ہے۔ لہٰذا، یہ "منکر خویشتن شدن" ہے۔ اور جو اپنی ذات کا منکر ہے وہ خدا کا بھی منکر ہے۔

منکرِ حق نزد ملا کافر است
منکرِ خود نزد من کافر تر است

※

ایسا کیوں ہوا؟

واضح تعلیم کے بعد، مسلمانوں میں یہ خیالات اور معتقدات کیسے پیدا ہو گئے جو اُس تعلیم کے یکسر خلاف ہیں، اور جنہوں نے اس یکسر حرکت و عمل امت کو شل اور مفلوج کر کے رکھ دیا؟ آپ کے دل میں ان خیالات کا ابھرنا فطری امر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اور بہت سے غلط اور گمراہ کن معتقدات کی طرح یہ نظریات و معتقدات بھی ہمارے دور ملوکیت کے پیدا کردہ اور عجمی سازش کے پروردہ ہیں۔ مسلمانوں کے مطلق العنان بادشاہوں نے جب ظلم و استبداد کے اسلوب اختیار کئے اور کمزور و ناتواں انسانوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنا شروع کر دیا تو ان مظالم کے خلاف لوگوں کے دلوں میں ردِ عمل پیدا ہونا لازمی امر تھا۔ اس ردِ عمل کو روکنے کے لئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ ان بادشاہوں کو کب یہ اختیار حاصل ہو سکتا ہے کہ یہ لوگوں پر ظلم ڈھائیں۔ یہ بچارے تو خدا کی مشیت کے آلۂ کار ہیں۔ کائنات میں ایک پتہ بھی خدا کے حکم کے بغیر نہیں ہل سکتا۔ اس لئے جو کچھ ان کے ہاتھوں سے ہوتا ہے، سب خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔ حکومت و مملکت اس کی طرف سے ملتی ہے۔ وہی عزت دیتا ہے وہی ذلت۔ وہی راحت پہنچاتا ہے وہی تکلیف۔ اسکے حکم کے بغیر کوئی مصیبت نہیں آسکتی۔ اس لئے تم پر جو مصیبتیں آتی ہیں ان کے خلاف لب کشائی کرنا، خدا کی مرضی کے خلاف جنگ کرنا اور اس کے فیصلوں پر شکوہ سنج ہونا ہے۔ یہ کفر ہے۔ یہ الحاد ہے۔ انسان کو ہر حال میں راضی برضا رہنا چاہیئے۔ جو کچھ خدا کی طرف سے ہوتا ہے اس میں انسان کی بہر حال بہتری ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے خلاف لب پر کچھ لانا تو ایک طرف، دل میں بھی شکایت کا جذبہ پیدا نہیں ہونا چاہیئے۔

جب مستبد قوتوں نے رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں لے کر عوام کو روٹی سے محتاج کر دیا تاکہ وہ ان کے ہر اشارے پر چلنے کے لئے مجبور ہو جائیں، تو انہیں یہ افیون پلا کر سلا دیا گیا کہ رزق کی بسط و کشاد خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ جسے وہ چاہے بغیر حساب دے اور جسے چاہے نپی تلی دے۔ یہ خدائی تقسیم ہے جس کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں کر سکتا۔ جو کچھ خدا نے امیروں کو دیا ہے، غریبوں کو اس پر حسد نہیں کرنا چاہیئے۔ انہیں ہر حال میں شکر کرنا چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے خیالات، عقائد کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ جب تک مذہب کی طرف سے ان کی تائید نہ ہو۔ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا ہمیشہ گٹھ جوڑ رہا ہے۔ چنانچہ یہ حضرات آگے بڑھے اور ان خیالات کی تائید میں روایات وضع کرنی شروع کر دیں۔ اور چونکہ یہ تعلیم پہلے ہی سے عام کر رکھی تھی کہ قرآن کی آیات کی تفسیر روایات کی رو سے ہوتی ہے، اس لئے عوام میں ان خیالات کو "خدا اور رسول" کی تعلیم کی حیثیت سے پھیلا دیا گیا۔ اس عقیدہ کو کس قدر اہمیت دی گئی اس کا اندازہ اس ایک بات سے لگائیے

کہ قرآن کریم کی رو سے ایمان کے اجزا پانچ ہیں۔ یعنی اللہ پر ایمان۔ اس کے رسولوں پر ایمان۔ اس کی کتابوں پر ایمان۔ ملائکہ پر ایمان اور آخرت پر ایمان لانے سے ایک شخص مسلمان ہو جاتا ہے۔ لیکن

جزوِ ایمان

اب تقدیر کے اس عقیدہ کو، ایمان کا جزو بنا کر، کلمہ کے اندر داخل کر دیا گیا۔ چنانچہ اب مسلمان ہونے کے لئے ضروری قرار پا گیا کہ وہ یہ کہے کہ اٰمنت باللہ۔ و ملٰئکتہ۔ و کتبہ۔ و رسلہ والقدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ۔ و بعث بعد الموت۔ یعنی جب تک ایک شخص، خدا۔ ملائکہ۔ کتب۔ رسل۔ اور آخرت کے ساتھ، تقدیر پر ایمان نہ لائے وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔ آپ نے غور فرمایا کہ مستبد قوتوں نے اس عقیدہ کو، کس شدت کے ساتھ، امت کے رگ و پے میں سرایت کر دیا — ایسی شدت کے ساتھ کہ اس کے بعد اگر کوئی شخص یہ کہتا کہ انسان اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار ہے، تو اسے مرتد قرار دے کر، حوالۂ دار و رسن کر دیا جاتا۔

اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ مسلمانوں میں اس قسم کے نظریات کا پھیلانا عجمی سازش کا نتیجہ تھا تو یہ بھی ایک تاریخی حقیقت کا بیان ہے۔ ایران کے شاہی جیش کا نام اساورہ تھا۔ (یعنی سونے کے کنگن پہننے والے)

عجمی سازش

یہ اکبر کے نورتنوں کی طرح، مختلف علوم و فنون پر ماہرین کی جماعت تھی۔ جب مسلمانوں نے ایران فتح کیا تو اس جیش شاہی نے اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ اگر انہیں بھی مسلمانوں جیسی رعایات دی جائیں تو وہ مسلمان ہو کر اسلامی بستیوں میں آباد ہو جائیں گے۔ ان کی شرط منظور کر لی گئی اور یہ مسلمانوں کے شہروں میں پھیل گئے۔ اور وہاں، نہایت لطیف اور غیر محسوس انداز سے اپنے معتقدات و نظریات کی اشاعت شروع کر دی۔ تقدیر کے عقیدہ پر مجوسی (ایرانی) مذہب کی بنیاد تھی۔ انہوں نے اسے بھی عام کرنا شروع کیا۔ چنانچہ مسلمانوں میں سب سے پہلا فرقہ، مسئلہ تقدیر ہی کی بنا پر وجود میں آیا تھا۔ اس فرقہ کے بانی، معبد بن خالد کے متعلق تاریخ میں ہے کہ اس نے اس عقیدہ کو اساورہ کے ایک شخص سے مستعار لیا تھا جس نے اپنی کنیت ابو یونس رکھ لی تھی۔ چنانچہ اس طرح رفتہ رفتہ یہ عقیدہ، جو مجوسی مذہب کا جزو تھا، خود مسلمانوں کا چھٹا جزوِ ایمان قرار پا گیا۔ یعنی ایمان کے پانچ اجزا خدا کے مقرر کردہ، اور یہ چھٹا جزو، مجوسی اساورہ کا آوردہ!

ارباب اقتدار نے اس عقیدہ کو جزوِ ایمان بنوایا اور اس کے بعد اطمینان سے بیٹھ گئے کہ جو ان کے جی میں آئے کریں، مظلوموں اور ضعیفوں کے دل میں ان کے جور و استبداد کے خلاف احساسِ شکایت تک بیدار نہیں ہو سکتا۔ یہی ہے وہ حقیقت جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، اقبالؔ نے اپنی مشہور نظم — ابلیس کی مجلسِ شوریٰ۔

میں ابلیس کی زبان سے تحریر کہلوایا ہے کہ

ہیں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا

اس کا نتیجہ اور یہی وہ عقیدہ جس کی بنا پر یہ امت جس نے اقوام عالم کی تقدیریں بدل کر رکھ دی تھیں اور تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا تھا، راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی یا خود فریبی

عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

اگر اسے تقدیر کے چکر میں نہ الجھایا جاتا تو یہ اپنی ناکامی اور شکست کے وقت، کھڑا ہو کر سوچتا کہ مجھ سے کس مقام پر غلطی ہوگئی ہے۔ غلطی کے معلوم ہو جانے پر یہ اس کی اصلاح کرتا۔ اور اگر یہ دیکھتا کہ اس کا سبب وہ غلط نظام ہے جو اس پر مسلط کر دیا گیا ہے تو یہ اس نظام کو الٹانے کی سوچتا۔ لیکن اسے اس عقیدہ کی افیون سے اس طرح سلا دیا گیا کہ اسے نہ اپنی خامیوں اور غلطیوں کی اصلاح کا ہوش رہا اور نہ ہی غلط، مستبد نظام کے خلاف اٹھنے کا یارا۔ نتیجہ یہ کہ اس قوم کا عروج دن بدن مبدل بہ زوال ہوتا گیا اور ہم اس سطح پر جا پہنچے جس سے نیچے شاید ہی کوئی اور سطح ہو۔ اقبال ہی کے الفاظ میں۔

"تھی یہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز

تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

وہ قوم جس کی نگاہوں سے کبھی دنیا کی تقدیریں بدل جایا کرتی تھیں، آج خود ہر وقت اپنی تقدیر کا رونا روتی رہتی ہے۔ وہ جس کی پیشانی کے بل سے، امتوں کی بساطِ سیاست الٹ جایا کرتی تھی، آج اپنی "پیشانی کے لکھے" کے ہاتھوں مجبور و مقہور ہو کر سر بزانو بیٹھی ہے۔ وہ جس کے متعلق کہا تھا کہ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۳)۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے یعنی زمین۔ چاند۔ سورج۔ ستارے، ان سب کو خدا نے تمہارے لئے تابع تسخیر کر دیا ہے اس کی حالت یہ ہے کہ وہ آج اپنی تقدیر کو ستاروں کے تابع سمجھ کر نجومیوں سے فالیں لیتا پھرتا ہے اور نہیں سمجھتا کہ

تیرے مقام کو انجم شناس کیا جانے

کہ خاکِ زندہ ہے تو تابع ستارہ نہیں

کیا اس سے بڑا انقلاب بھی آسمان کی آنکھ نے کبھی دیکھا ہوگا۔ آپ نے غور کیا کہ ایک عقیدہ کے بدلنے سے کس طرح قوموں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں! عقاید کی قوت بڑی ناقابل شکست اور ان کی

گرفت بڑی محکم ہوتی ہے۔ اس کا مقابلہ دنیا کی کوئی اور قوت نہیں کر سکتی۔ غلط عقاید کی استحواں شکن گرفت کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ انہیں صحیح عقاید سے بدلا جائے۔ لیکن مفاد پرست قوتیں اس کی کبھی اجازت نہیں دیتیں۔ جن لوگوں کے دل میں ایسا خیال پیدا ہوتا ہے، یہ قوتیں، مذہبی پیشوائیت کو آگے بڑھا دیتی ہیں جو عوام کو یہ کہہ کر مشتعل کرتی ہیں کہ دیکھو! یہ تمہیں ورغلا کر تمہارے اسلاف کے راستے سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے۔ یہ تمہارا ایمان خراب کرتا ہے۔ یہ تمہارا مذہب بگاڑتا ہے۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔ لیکن اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ خدا کی

گھبرانے کی بات نہیں

زندہ و پائندہ کتاب ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم اپنے ہر مروجہ نظریہ اور عقیدہ کو اس کتاب کی روشنی میں پرکھیں۔ جس کی تائید اس سے ہوتی ہو اسے قابلِ قبول سمجھیں جس کی وہ تردید کرے اسے مسترد کر دیا جائے۔ اور جب اس طرح ہم صحیح قرآنی نظریات زندگی کے حامل ہو جائیں تو ہماری عظمتِ رفتہ ہمیں پھر سے مل سکتی ہے۔ اس لئے کہ

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں
ناداں جسے کہتے ہیں، تقدیر کا زندانی

قرآن کریم کا یہ بنیادی قانون یاد رکھئے کہ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (۴۲/۳۰) - جو مصیبت بھی تمہیں پہنچتی ہے وہ خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یا تو کوئی تمہاری اپنی ذاتی غلطی ہوتی ہے۔ اور یا اس کا ذمہ دار تمہارے معاشرہ کا غلط نظام ہوتا ہے۔ اس اصول کو سامنے رکھنے والا، ہر مصیبت اور تکلیف کے وقت سوچے گا کہ اس کا سبب کیا ہے۔ اگر وہ اس کی اپنی غلطی ہے تو اس کی اصلاح کرے گا۔ اور اگر اس کا ذمہ دار معاشرہ کا غلط نظام ہے تو وہ اس نظام کو بدلنے کی کوشش کرے گا۔ جب زاویۂ نگاہ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا ہو جائے اور معاشرہ کے نظام کو صحیح قرآنی خطوط پر متشکل کر دیا جائے، تو پھر نہ کوئی برکت، علاج کے بغیر بن آئی موت مرتا ہے اور نہ ہی کوئی مائی کا لعل بے آسرا رہ جانے کی وجہ سے صفِ ماتم بچھا کر روتی ہے۔ نہ کسی عبدالرزاق کو محنت کرنے کے باوجود فاقے کرنے پڑتے ہیں اور نہ کوئی شہامد خان، جائز و ناجائز طریق سے کمائی ہوئی دولت کے زور پر صاحبِ عزت بن سکتا ہے۔ نہ کسی نور خان کی بیوی کو لڑکی پیدا ہونے کے احساس سے سسکیاں بھرنی پڑتی ہیں اور نہ ہی کوئی نادرہ غلط جگہ شادی ہو جانے سے تپ دق میں مبتلا ہوتی ہے۔ اس معاشرہ میں لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ کی جنت بدوشِ فضا عام ہو جاتی ہے۔ اس میں مجرم کے علاوہ کسی کو نہ کسی قسم کا خوف دامنگیر ہوتا ہے، نہ حزن اور دل گرفتگی وجہِ پریشانی بنتی ہے۔

آخر میں، اتنا اور عرض کر دوں کہ مسئلۂ تقدیر جسے اس قدر پیچیدہ، مشکل بلکہ لاینحل بنا کر رکھ دیا گیا ہے، قرآن کریم نے اسے، قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں، دو فقروں میں حل کر دیا ہے۔ آدم سے بھی معصیت ہوئی اور ابلیس سے بھی۔ جب آدم سے پوچھا گیا کہ تو نے ایسا کیوں کیا تو اس نے جواب میں کہا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا (۷/۲۳) ۔ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم نے اپنے آپ پر زیادتی کی۔ ہم تصور دار ہیں۔ یعنی اس نے اپنی غلطی کا ذمہ دار اپنے آپ کو ٹھہرایا۔ اس سے، اس پر توبہ کے دروازے کھل گئے۔ یعنی اس کے لئے اصلاحِ خویش اور تغیرِ احوال کی گنجائش پیدا ہو گئی۔

لیکن جب ابلیس سے کہا گیا کہ تو نے ایسا کیوں کیا۔ تو اس نے جواب میں کہا کہ میں نے ایسا نہیں کیا۔ رَبِّ بِمَا اَغْوَيْتَنِيْ (۱۵/۳۹)، پروردگار! تو نے مجھے گمراہ کیا۔ یعنی اس نے اپنی غلطی کے لئے اپنی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کیا۔ اور اپنے آپ کو مجبور ظاہر کیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ دھتکارا گیا۔ اس کے لئے اصلاحِ حال کی گنجائش ہی نہ رہی۔ اقبالؔ اسے، اس کی پستیٔ فطرت سے تعبیر کرتا ہے، جب کہتا ہے کہ

پستیٔ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے
کہتا ہے تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام
ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دُود

ذمہ داری سے فرار کی وجہ پستیٔ ہمت ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ ابدی مایوسی (ابلیس کے معنی ہی مایوس کے ہیں)۔ اس لئے کہ جو یہ کہتا ہے کہ میں خود کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھ سے سب کچھ کوئی اور کراتا ہے۔ وہ اپنی اصلاح یا حالات میں تبدیلی کیسے پیدا کر سکتا ہے۔ یاد رکھئے مایوسی قرآن کی رو سے کفر ہے — یعنی اپنی ذات کی ممکنات اور قانونِ خداوندی کی محکمیت سے انکار — یہی وہ حقیقت ہے جس کے متعلق اقبالؔ نے کہا ہے کہ

کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیرِ مسلمان
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

یعنی جو کچھ مشیتِ خداوندی کا پروگرام چاہتا ہے کہ دنیا میں ہو، مومن اپنے اختیار و ارادے سے بطیبِ خاطر وہ کچھ کر کے دکھا دیتا، اور یوں تقدیرِ الٰہی بن جاتا ہے۔ مومن کی تقدیر پہلے سے لکھی ہوئی نہیں ہوتی۔ یہ اپنی تقدیر آپ بناتا ہے۔ اسی لئے، مومن سے، کہا گیا ہے کہ

تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تیری جبیں

خدا کا یہ ارشاد کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (۴۱/۴۰) - تم اپنی مرضی کے مطابق جو چاہو کرو — اس باب میں حرفِ آخر ہے۔ عالمِ امر میں خدا کی مشیت کارفرما ہے جس میں انسان دخل نہیں دے سکتا۔ عالمِ کون و فساد میں انسان کو صاحبِ مشیت بنایا گیا ہے جس میں خدا اپنے لامحدود اختیارات کے باوجود دخل نہیں دیتا۔ وَ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (۳۰/۳۰)

انسانی آزادی کی یہ تعلیم قرآن کریم کی منفرد خصوصیت ہے جو دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ملتی۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اگر خدا کو اس طرح قوانین کا پابند بنا دیا جائے تو اس کے قادرِ مطلق ہونے پر حرف آتا ہے۔ لیکن یہ اعتراض غلط نگہی پر مبنی ہے۔ اگر کوئی اور ہستی خدا کے اختیارات پر کسی قسم کی پابندی عائد کرے تو اس سے واقعی خدا کے قادرِ مطلق ہونے پر حرف آ سکتا ہے۔ لیکن اگر خدا، خود اپنی مرضی سے اپنے آپ پر کوئی پابندی عائد کرتا ہے تو اس سے اس کے صاحبِ اختیار ہونے پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ یہ تو بلکہ اس کے صاحبِ اختیار ہونے کی ایک اور دلیل اور شہادت ہے۔ مثلاً اس نے قرآن کریم میں کچھ احکام اور اصول دیئے ہیں اور اس کے بعد کہہ دیا ہے کہ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (۱۰/۶۴) - خدا کے ان احکام و اصول میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ اس سے خدا نے خود اپنے اوپر ایک پابندی عائد کر لی ہے کہ وہ ان احکام میں تبدیلی نہیں کرے گا۔ اس باب میں یوں کہا جائے گا کہ خدا ایسا کر تو سکتا ہے لیکن وہ ایسا کرتا نہیں۔

یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے، خدا کی ذات درمیان میں سے نکل جاتی ہے۔ خدا کی اطاعت کرنا چاہیئے۔ قوانینِ خداوندی کی اطاعت نہیں۔ یہ اعتراض کرنے والے وہ لوگ ہیں جو دن رات کہتے رہتے ہیں کہ ہمیں احکامِ خداوندی کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ اگر احکامِ خداوندی کی اطاعت سے، خدا درمیان میں سے نہیں نکل جاتا تو قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے خدا درمیان میں سے کس طرح نکل جاتا ہے؟ انہیں کون سمجھائے کہ جب کوئی حکم غیر متبدل ہو (یعنی وہ ہر روز تبدیل نہ ہوتا رہے) تو اسے قانون کہا جاتا ہے۔ خدا کے غیر متبدل احکام ہی خدا کے قوانین ہیں جن کی اطاعت ضروری ہے۔

اس پر یہ کہا جائے گا کہ تم، خدا کی مرضی یا خدا کا حکم کیوں نہیں کہتے۔ خدا کا قانون کیوں کہتے ہو؟ یہ اس لئے کہ خدا کی مرضی یا حکم کے متعلق ہمارے ہاں جو عام تصور پیدا ہو چکا ہے وہ یہ ہے کہ اس کی مرضی اور حکم ہر آن بدلتے رہتے ہیں۔ یہ تصور قرآن کریم کے خلاف ہے۔ اس کی مرضی جو اس کے احکام کی شکل میں ہمارے سامنے آئی ہے، غیر متبدل ہے اس لئے اسے قانون کہنا انسب ہے۔ اس کا عملی نتیجہ بڑا دور رس ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں وہی حکومت انسانیت کے تقاضوں کو پورا کر سکتی ہے جو صفاتِ خداوندی کی مظہر ہو۔ اب اگر ہم خدا کے متعلق یہ تصور رکھیں کہ اس کے احکام ہر آن بدلتے رہتے ہیں اور وہ کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہیں تو اس تصور کے مطابق جو حکومت یہاں قائم ہوگی (اور جسے حکومتِ خداوندی کہا جائے گا) اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس قسم کی ہوگی! کیا اس قسم کی حکومت کو آپ ایک ثانیہ کے لئے بھی برداشت کر سکتے ہیں جو نہ کسی قاعدے کی پابند ہو نہ قانون کی! یاد رکھیے! خدا کے تصور کا ہماری عملی زندگی پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ جس قسم کا کسی قوم کا خدا اسی قسم کی اس قوم کی زندگی۔ قرآنی تصور کا خدا، اپنی لاانتہا قوتوں کے باوجود، قاعدے اور قانون والا خدا ہے اس لئے اسے ماننے والی قوم بھی دنیا میں انتہائی درجے کی قاعدے اور قانون کے مطابق چلنے والی قوم ہوگی۔ یہی تقدیر کا عملی مفہوم ہے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ جس قوم کو ہزار برس سے ملوکیت کا محکوم رکھا گیا ہو وہ حکم کی اطاعت تو سمجھ سکتی ہے، قانون کی اطاعت اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ ملوکیت قانون کے تصور کی طرف آنے ہی نہیں دیتی۔